سیّد محمد مہدی

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

مارکس، ترقی پسندی اور جدیدیت

(حقائق اور مسائل)

دنیا کس برق رفتاری سے بدل رہی ہے اور یہ ہر لحہ بدلتی دنیا سمٹ کر ہمارے شہر ہمارے گاؤں ہمارے گھر کے اندر آگئی ہے اور نئی نسل کی تمناستاروں سے آگے دوسرا قدم اٹھانے کی منتظر ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمارے کمرے میں روز بوسنیا اور افغانستان کی لاشیں، زخمی روحیں تڑپتی ہوئی در آتی ہیں۔ مڈونا گوشت پوست کی دوکان سجا کر آتی ہے۔ مائیکل جیکسن اپنے گٹار اور سبزہ آغازوں کے ساتھ کودتا، تھرکتا، ناچتا گاتا ہوا آجاتا ہے۔ فلسطین اور جنوبی افریقہ کے جیالے آفتابِ تازہ کی بشارت اپنی آنکھوں میں لئے ہمیں روز دعوتِ عمل دیتے ہیں۔ انسان کی حیرت انگیز ایجادیں اور جنگ و قتل کے تازہ ترین ہتھیار کبھی ہمیں حیرت میں ڈالتے ہیں، کبھی خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ ساری دنیا اور خاص طور پر ہندوستان کے اربابِ اختیار اور دانش وران باوقار ٹوٹے ہوئے تاروں، مٹتی ہوئی قدروں پر ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ ٹیریلین کی پتلون پہنے ہوئے کسان اپنے ٹریکٹر میں یا بیل کی سنگ میں لٹکے ہوئی ٹرانزسٹر سے جب جب گانا سنتا ہے کہ 'چولی کے پیچھے کیا ہے' تو شہروں کے بابو لوگوں پر ہنستا ہے کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ چولی کے پیچھے کیا ہے اور پھر کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگاتا ہے۔ جوبنا نکلا چھاتی پھوڑ۔ آدھا کجرا آدھا گور۔ لیکن پارلیمنٹ کے عاقلان والا تبار خائف ہیں کہ مڈونا اور چولی کا گانا ہماری تہذیب کی خوبصورت روایتوں کو ختم کر دینے کے درپے ہے۔ ہمیں اچھا لگے یا برا لیکن ماڈرن دنیا ہمارے بہت سے بت توڑ چلی ہے اور توڑتی جارہی ہے۔

ہماری تہذیب جامد نہیں ہے۔ ہم کسی دوسری تہذیب کی زد میں نہیں ہیں بلکہ تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں میں خود بھی شریک ہیں۔ شاعر اور فنکار کی چھٹی حس اس برق پا تبدیلی کو سیاست دانوں اور سماجی علوم کے عالموں کے مقابلے میں جلدی محسوس کر لیتی ہے۔ لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدید دنیا کے اس اضطراب پیہم کے محرکات کو سمجھا جائے اور اس تناظر میں اپنی مشترکہ یا وفاقی تہذیب کو دیکھا جائے۔ شاعری کو اس زلزلے اور اضطراب کی پیمائش کا آلہ سمجھ کر مندرجہ ذیل سطور میں اسی ماڈرن دنیا اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی ایک ابتدائی کوشش کی گئی ہے۔

(۱)

ہمارا زمانہ جسے چاہے آپ ماڈرن کہیں یا جدید یا پس جدید اسے سرمایہ داری نے جنم دیا ہے اور یہ اسی کا پروردہ ہے۔ وہ انتہائی خوش حال ملک ہوں یا انتہائی پس ماندہ سب اسی جدید دنیا کے حلقے میں اسیر اور آزاد ہیں۔ یہ نئی دنیا قومی سرحدوں، نسلوں، مذہبوں کی حد بندیوں کو کب کی توڑ چکی ہے۔ لیکن اس اتحاد میں انتشار ہے۔ سب ملتے ہیں، بچھڑتے ہیں، لڑتے ہیں، ملتے ہیں، پھر لڑتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری و ساری ہے۔ ~ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

آج انسان پرامید بھی ہے اور خوف زدہ بھی۔ کچھ ہیں جو اس مسلسل تگ و دو اس پیہم تغیر و تبدّل سے ہراساں ہو کر "فردوس گم گشتہ" کے کہانی قصوں سے دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ "مٹتی ہوئی قدروں" پر آنسو بہاتے ہیں اور انہیں خیالی زیوروں سے آراستہ کر کے دیوی دیوتا کی طرح ان کی پوجا کیا کرتے ہیں۔ لیکن نہ فردوس گم گشتہ ان کے ہاتھ آتی ہے نہ مٹتی ہوئی قدروں کے دیوی دیوتا اپنے مٹی کے مادھو ہونے کی حقیقت کو چھپا سکتے ہیں۔

ہماری اس جدید دنیا کا خمیر کس چیز سے تیار ہوا ہے؟ سائنس کی حیرت انگیز دریافتیں اور ان کے ذریعہ ہر لمحہ بدلتی اور ترقی کرتی ٹکنالوجی اشیاء صرف پیدا کرنے کے لئے مشینوں کا

استعمال عرش و فرش کے متعلق نو بہ نو معلومات، انفارمیشن ٹکنالوجی کی جادوی دنیا، نئی بستیوں، نئے ماحول کا عروج قدیم بستیوں اور قدیم ماحول کا زوال اور خاتمہ، دربدری، بے وطنی، نئی وابستگی، قومی ریاست اور طاقتور بیوروکریسی کا عروج، حکمرانوں اور بین الاقوامی اجارے داروں کی پالیسیوں کے خلاف عوام کی تحریکیں اور تنظیمیں، ایک عالم گیر منڈی کا وجود جسے ایک لمحہ بھی قرار نہیں۔ جو کبھی گرتی ہے کبھی سنبھلتی ہے کبھی بڑھتی ہے کبھی گھٹتی ہے۔ جو اپنے تضادات کا شکار ہے۔ جس نے ہر انسانی قدر کو زرِ نقد میں بدل دیا ہے۔ جس نے فرد کو کھلی منڈی میں لا کھڑا کیا ہے اور وہ بھی اس حال میں کہ اس سے اسکا لباس تک چھین لیا ہے۔

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

جدید شاعری جدید افسانہ، جدید ناول غرض کہ جدید فن اس جدید دنیا کو گرفت میں لانے اور اسکا تخلیقی اظہار کرنے کا نام ہے۔ اردو میں اول اول اس رویہ کو ترقی پسندی کا نام دیا گیا اور آگے چل کر اسے جدیدیت یا پس جدیدیت کے نام سے پکارا گیا۔ لیکن اصطلاحیں تو کسی تحریک کسی واقعہ کسی رویہ یا کسی رجحان کے وجود میں آنے کے بعد گڑھی جاتی ہیں۔ ماڈرن دنیا نے مغرب میں آنکھ کھولی۔ ہندوستان جس وقت اس سے دوچار ہوا تو اس وقت تک وہ توپ اور بندوق سے لیس ہو کر استحصال پر کمربستہ تھی۔ تو یہ نئی دنیا ہندوستان کے دانش وروں اور فنکاروں کے لئے چیلنج بن کر آرہی تھی۔ غالب سے لے کر اقبال اور جوش تک، شرر، سرشار اور رسوا سے پریم چند تک، سرسید آزاد، حالی اور شبلی سے لے عبدالرحمٰن بجنوری تک سب ہی ان اصطلاحوں کے وجود میں آنے سے پہلے اس تخریب گر و تعمیر ساز جدید دنیا سے اپنی اپنی طرح دست و گریباں تھے۔ کبھی ہراساں تو کبھی شاداں کبھی حیرت زدہ تو کبھی پریشان۔

خوشم کہ گنبدِ چرخِ کہن فروریزد
اگرچہ خود ہمہ برفرقِ من فرو ریزد (غالب)

منجم کی تقویم فردا ہے باطل
گرے آسماں سے پرانے ستارے (اقبال)

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا (اکبر)

بعد میں جنھیں ترقی پسند اور جدیدیت پسند شاعر یا افسانہ نگار کہا گیا وہ بھی اسی بدلتی جدید دنیا سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ انفرادی تجربے اور ان کے اظہار کے طریقے الگ الگ ہیں لیکن حقیقت واقعی ایک ہے۔ یہ حقیقت واقعی کیا ہے؟ جنھیں ترقی پسند کہا گیا ان میں سے بیشتر نے کارل مارکس کی مدد سے اس حقیقت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ہم مارکس کے اس اندازِ فکر کا سرسری سا جائزہ لیں جس نے ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کے دانشوروں، عالموں، ادیبوں محنت کشوں کو اس بڑے پیمانے پر متاثر کیا کہ ہم بیسویں صدی کے علوم ادب اور فن کا ذکر مارکس کے حوالے کے بغیر کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اس لئے اہم ہے کہ اس نے اس جدید دور کا تجزیہ کرنے، اسے گرفت میں لانے اور اسے بدل دینے کا طریقۂ عمل ہمیں بتایا۔

مارکس اس نئی یا جدید دنیا کا نقیب بھی ہے، اسکا خیر مقدم کرنے والا بھی اس کا زبردست نقاد بھی۔ اس کی عقابی نظر اس جدید دنیا کے تمام ظواہر کی تہہ میں متحرک لاوہ کی طرح ابلتی ان لہروں کو دیکھ لیتی ہے جو اس عہد کو زندگی کی کشمکش اور اضطراب عطا کرتی ہیں۔ جو نئے طبقے، نئی بستیاں پیدا کرتی ہیں لیکن فرد کو اپنے کام سے اور ماحول سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔ اردو تنقید کی سکہ بند اصطلاحوں میں کہا جائے تو مارکس ترقی پسندی کا امام بھی ہے اور جدیدیت کا علمبردار بھی۔ خود اس کی زبان سے سنئے۔

"بورژوازی نے اپنے بہ مشکل ایکسو برس کے دورِ حکمرانی میں اتنی بڑی اور دیو پیکر پید آور قوتیں تخلیق کرلی ہیں کہ پچھلی تمام نسلیں مل کر بھی نہ کر سکی تھیں۔ نیچر کی طاقتوں پر انسان کی کارفرمائی، کھیتی کے لئے پورے پورے براعظموں کی صفائی، دریاؤں سے نہر کاٹنا اور گویا جادو کے زور سے زمین کا سینہ چیر کر چشم زدن میں بڑی بڑی آبادیوں کا ظہور میں لے آنا۔ آج سے پہلے کس زمانے کے لئے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ اجتماعی محنت کی گود میں ایسی ایسی پید آور طاقتیں پڑی سو رہی ہیں۔" (کمیونسٹ مینی فسٹو)

جو چیز یہاں مارکس کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ہے حضرت انسان کی تگ و دو، انرجی، قوت۔ انسان جو سرگرمِ عمل ہے، رواں دواں ہے نو بہ نو چیزیں دریافت کرتا ہے۔ زمین کا سینہ چاک کر کے دولت کا انبار لگاتا ہے۔ نیچر کو اپنے لئے ڈھالتا ہے اور خود بھی ڈھلتا جاتا ہے اور اگر منظم کوشش دنیا کو اس طرح بدل سکتی ہے تو کیوں نہ ساتھ مل کر اسے اور تبدیل کرنے اور بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔

اب مارکس اس متحرک اور فعال قوت کا ایک اور رخ دکھاتا ہے اور اپنے تخیل کو اول بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ "پیداوار میں پیہم انقلابی تبدیلیاں، جملہ سماجی تعلقات میں لگاتار خلل، دائمی بے یقینی اور ہلچل بورژوازی کے عہد کو پہلے کے تمام زمانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تمام دیرینہ تعلقات جو پتھر کی لکیر بن چکے تھے۔ اپنے قدیم محترم تصورات اور خیالات کے لاؤ لشکر سمیت نیست و نابود ہوئے اور نئے قائم ہونے والے تعلقات جڑ پکڑنے بھی نہیں پاتے کہ فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کچھ جو ٹھوس ہے پگھل کر ہوا ہو جاتا ہے جو پاک ہے وہ ناپاک ہو جاتا ہے اور انسان آخر کار مجبور ہوا کہ اپنی زندگی کی حقیقتوں کا اور ہم جنسوں کے ساتھ اپنے تعلقات کا پورے ہوش و حواس کے ساتھ جائزہ لے۔" (ایضاً)

مارکس اپنی پروازِ تخیل کے ذریعہ اس گرتی رفتار کو دکھا رہا ہے جو جدید زندگی کا طرہ امتیاز ہے۔ جو ٹھوس ہے وہ پگھل کر ہوا ہو رہا ہے۔ جو بھی پاک تھا وہ نجس قرار پاتا ہے۔ یہ متحرک

تصویریں ہیں۔ استعاروں میں حرکت ہے، رفتار ہے، مارکس ہمیں ایک ایسی دنیا میں لا کھڑا کرتا ہے جہاں متضاد قوتیں برسرِ پیکار ہیں۔ جہاں تبدیلی اور تغیر کا نام ہی زندگی ہے۔ یہاں شکست و ریخت ہی تعمیر کا پتہ دیتی ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعمیر و تخلیق شکست و ریخت کا پتہ دیتی ہے۔ مارکس کی زبان سے سنئے۔

"جدید بورژوا سماج نے گویا جادو کے زور سے پیداوار اور تبادلے کے عظیم الشان وسیلے کھڑے کرے ہیں۔ مگر پیداوار تبادلے اور ملکیت کے اپنے رشتوں سمیت اس سماج کی حالت اس شعبدہ گر کی سی ہے جس نے اپنے جادو سے شیطانی طاقتوں کو جگا تو لیا ہے مگر انہیں اب قابو میں نہیں رکھ سکتا۔" (ایضاً)

یعنی سرمایہ داری اس طبقے اور قوتوں کو بھی جنم دیتی ہے جو خود اسے راستے سے ہٹا کر ان شیطانی قوتوں کی باگ ڈور انسان کے ہاتھ میں دے دینا چاہتی ہیں۔ اس جدلیاتی قانون سے مفر نہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

لکھی یاروں کی بد مستی نے میخانے کی پامالی
ہوئی قطرہ فشانیہائے مے بارانِ سنگ آخر

مارکس اس سے ایک اور اہم نتیجہ نکالتا ہے۔ "بورژوازی نے ہر اس پیشے سے اس کے گرد کا ہالۂ تقدس چھین لیا جس کی اب تک عزت ہوتی آئی تھی اور جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے طبیب، وکیل، پروہت، شاعر، اہل علم سب کو اپنا تنخواہ دار اجرتی مزدور بنا دیا۔ اس نے خاندانی رشتوں کو محض روپے آنے پائی کا رشتہ بنا کر رکھ دیا ہے۔"

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح (مجروح)

مارکس جس طرح جدید دنیا کے سلسلے میں ایک ایسی آندھی اور ایسے بگولوں کا نقشہ پیش کرتا ہے جن میں تمام حقائق تمام قدریں طوفان میں منتشر ہوتی نظر آتی ہیں، بکھرتی ہیں، سڑتی ہیں، پھر سے نئی شکلیں اختیار کرتی ہیں تو اس سے مختلف، متضاد اور ملے جلے رویے اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں تحیر بھی ہے ولولہ اور جوش و خروش بھی، ہیبت بھی ہے اور بے بسی کا احساس بھی۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا (سردار جعفری)

مجھے وداع کرا ے مری ذات
تو اپنے روزنوں کے پاس آ کے دیکھ لے
کہ ذہنِ ناتمام کی مساختوں میں پھر
ہر اس کی خزاں کے برگِ خشک یوں بکھر گئے
کہ جیسے شہرِ ہست میں
یہ نیستی کی گرد کی پکار ہوں
لہو کی دلدلوں میں حادثوں کے زہر یار اتر گئے
کہ مشرقی افق پہ عارفوں کے خواب خوابِ قہوہ رنگ ہیں
امید کا گزر نہیں
کہ مغربی افق پہ مرگِ رنگ و نور پر کسی کی آنکھ
تر نہیں (ن م راشد)

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں دہشتِ فردا سے نڈھال
(فیض احمد فیض)

فضا میں موت کے تاریک سائے تھر تھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں (مجازؔ)

ہم جن چیزوں کو بنیادی اساسی قیمتی اور حقیقی تصور کرتے ہیں مارکس ان کے متعلق ایک بنیادی بے یقینی کا اظہار کرتا ہے۔ یقین اور بے یقینی کی اس کش مکش کا اظہار فن کے مختلف شعبوں میں نظر آتا ہے۔

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا (یگانہ)

یہ نیا زمانہ اے دل جو وقار کھو چکا ہے
اسے اپنی سر بلندی اسے اپنا بانکپن دیں
لبِ تیغ پر لہو ہے لبِ زخم پر تبسم
یہ حیات تن برہنہ اسے کیسا پیرہن دیں
نئی روح جسم خستہ کو عطا نہ ہو سکے تو
یہ کریں کہ روحِ نو کو کوئی ایک نیا بدن دیں (سردار جعفری)

اپنے علمی تجربے اور فلسفیانہ دور بینی کی بنیاد پر مارکس ایک نئی دنیا کو وجود میں آتے دیکھتا ہے۔ جہاں خود اس کے الفاظ میں "طبقوں اور طبقاتی اختلافوں کے بدلے ایک ایسی ملت قائم ہو گی جس میں ہر شخص کی آزاد ترقی سبھوں کی آزاد ترقی کی شرط ہو گی۔"

یہ ایک ایسا آدرش ہے جو صدیوں سے لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں بسا ہوا ہے۔ ایک خواب ہے جو مدتوں سے انسان دیکھتا آیا ہے۔ مارکس نے اس آدرش کو نہ صرف قابلِ حصول بتاتا بلکہ اس کی طرف عملی قدم بھی بڑھایا۔ یہاں تک کہ اس عملی کام کی وجہ سے وہ اپنا علمی

کام بھی مکمل نہ کرپایا۔ یہی خواب انسان کو زندگی کا حوصلہ بھی دیتا ہے اور اپنی غیر اطمینان بخش دنیا کو بدلنے کا عزم بھی۔

تجھے دنیا کو بدلنے کی ہوس ہے اے کاش
تجھے دنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا (فراق)

مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب
ابرِ غم زلفِ جہاں پر بال جنباں ہے تو کیا (جوش)

نہیں ہر چند کسی گم شدہ جنت کی تلاش
اک نہ اک خلدِ طربناک کا ارماں ہے ضرور (مجاز)

عروسِ جواں سالِ فرداحجابوں میں مستور
گرسنہ نگہ زور کاروں میں رنجور
مگر اب ہمارے نئے خواب کابوسِ ماضی نہیں ہیں
ہمارے نئے خواب ہیں آدمِ نو کے خواب
جہاں تگ ودو کے خواب (ن،م، راشد)

(۲)

میں شعروں کی تلمیحات اور استعاروں اور شاعروں کے زورِ بیان میں اتنا کھو گیا تھا کہ ایک عزیز اور محترم دوست کی آوازنہ سنائی دی۔ جب چونکا تو وہ کہہ رہے تھے میاں یہ شاعری کی باتیں چھوڑو اور اعتراف کرلو کہ مارکس اور سوشلزم کی ساری باتیں قصہ پارینہ ہوئیں اور مارکٹ اکانومی نے ثابت کر دیا کہ سوشلسٹ مارکٹ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ سوویت یونین کا خاتمہ اسکا ثبوت ہے اور پھر یہ بھی تو یاد کرو کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے مارکسزم کے نام پر یہاں کیا کیا بے ادبیاں روا رکھی تھیں۔

میں نے عرض کیا حضرت ہمیں مختلف چیزوں کے انتقال پر ملال کی خبریں وقتاً فوقتاً ملتی رہی ہیں۔ کوئی سو سال پہلے خدا کے مرنے کی اطلاع آئی تھی۔ پھر فلسفے کی موت کی خبر آئی۔ اس کے بعد آئیڈیالوجی کے خاتمے کی سناونی آئی اور اب مارکسزم کے انتقال کی اطلاع ملی۔ خدا کے متعلق کچھ کہتے ہوئے اس لئے خوف آتا ہے کہ کہیں میری موت کا فتویٰ نہ صادر ہو جائے مگر مارکس کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مارکس "در بغل دارد" والی کتاب لکھ رہا تھا تب سے اب تک بہت سے لوگوں نے اس کے مرنے کی اطلاع بہم پہونچائی لیکن عجب ستم ظریفی ہے کہ تفتیش کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ ہمارے علمی خزانے میں اس طرح شامل ہو گیا ہے کہ بڑی چھان پھٹک کے بعد بھی اسے الگ نہیں کیا جاسکا ہے۔

مارکس کی تفسیریں اور تعبیریں بہت ملیں گی۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مارکس کے خیالات نے ایسی زبردست مقبولیت حاصل کی کہ بے شمار قومی اور عالم گیر تحریکوں نے اسے اپنا پیغمبر تسلیم کر لیا اور آپ جانتے ہیں کہ پیغمبروں کا حشر کیا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کی باتوں کو عام لوگوں تک پہونچانے کے لئے انہیں آسان کیا جاتا ہے اور اس طرح اکثر ان کے معنی ہی بدل جاتے ہیں پھر ان کے نام سے حدیثیں گڑھی جاتی ہیں اور ان کے ہر جملے کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے آخری حکم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مفسرین اور محدثین یہ کام اپنے سر لیتے ہیں اور عام لوگ انہیں کے ذریعہ پیغمبروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان کے فرسودات کو فرسوداتِ پیغمبر مانتے ہیں۔ اب اور نجنل کی طرف جانے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ مستند مفسر خود پیغمبر کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں یا نائب پیغمبر کا۔ مارکس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تب ہی تو فرانس کے مارکس وادیوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے مارکس نے کہا تھا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں مارکسسٹ نہیں ہوں۔

ہمارے ملک میں مارکسزم روس سے ہوتی ہوئی آئی جہاں کی بیوروکریسی یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی کہ مارکسزم وہی ہے جو ہم کہتے اور کرتے ہیں۔ بالشویک پارٹی کی تاریخ میں ساری مارکسزم کا نچوڑ آگیا ہے۔ اس کے آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ استالن کے الفاظ مارکسزم ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب مارکس سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کا محبوب ترین اصول کیا ہے تو اس نے جواب دیا۔ "تشکیک"۔

جہاں تک انجمن ترقی پسند مصنفین کا سوال ہے تو اس کے دو پہلو ہیں جن پر نظر رکھنا مناسب ہوگا۔ ایک ہے تحریک اور دوسرا ہے تنظیم۔ ہندوستان میں یہ تحریک قومی آزادی کی جدوجہد اور انقلاب روس کے عظیم الشان انسانی آدرشوں اور سماجی انصاف کے لئے تڑپ اور مارکسزم کی تعلیمات کے زیر اثر وجود میں آئی۔ محروم اور مظلوم نے اپنی زنجیریں اتار پھینکی تھیں۔ ذہنوں سے جالے ہٹ رہے تھے۔ کمزور اب حکومت کر رہے تھے۔ گورکی 'ماں' کوفسکی 'اسے نن' میر ہولڈ آئی سنس ٹائن۔ ادب سنیما تھیٹر غرضکہ فن کے ہر میدان میں نئے تجربے کئے جا رہے تھے۔ آرٹ نئی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ انسانی ذہن کو نئے اشقالک مل رہے تھے۔ برنارڈ شا ایچ جی ویلز، رومیں رولاں، ٹیگور، نہرو، اقبال سب ہی محکوم اور مجبور کی آزادی اور اس کے راج کے گن گا رہے تھے۔ یہ اس زمانے کے تہذیبی مزاج کے عین مطابق تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اسی تحریک کو منظم شکل دینے کی ایک کوشش تھی۔ یہ تجربہ اسی حد تک کامیاب رہا جس حد تک اس میں تخلیقی امکانات باقی رہے۔ محروم اور مظلوم کی آواز اردو ادب کی اصل آوازیں بن گئی۔

رہ گئی تنظیم تو وہ تحریک کا ساتھ نہ دے پائی۔ تحریک کی حرکت تنظیم کے اضلاع کو توڑتی ہے۔ اگر تنظیم میں لچک ہے، وسعت کے امکانات ہیں۔ اپنے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت ہے تو خاصی مدت کے لئے وہ تحریک کے فروغ کا وسیلہ بنی رہ سکتی ہے۔ لیکن کوزے میں سمندر اسی حد تک سماتا ہے جتنا کوزے کا ظرف ہو۔ جب تنظیم نے تحریک کے

تغیر پذیر لچک دار اور رواں دواں کردار پر وحی والہام کا لیبل لگا کر مقید کرنے کی کوشش کی تو تحریک تنظیم کی دیواریں توڑ کر آگے کی طرف بڑھ گئی۔ دیواریں حیرت سے دیکھتی رہ گئیں۔

(۳)

جدیدیت کیا ہے؟ کسی بھی تصور کی کوئی مکمل تعریف ممکن نہیں۔ جدیدیت کی بھی الگ الگ تعریفیں اور تفسیریں پیش کی گئیں۔ کسی نے کہا "خالص فن" کی تلاش جدیدیت ہے۔ کسی نے کہا موضوع سے انحراف اور تکنیک کی جستجو یہی جدیدیت کی پہچان ہے۔ لیکن میرے خیال میں جدیدیت کی صحیح تعریف ن م راشد نے کی ہے۔ اپنے ایک مضمون "جدیدیت کیا ہے" میں وہ لکھتے ہیں کہ جدیدیت "اس بے قراری کی نتیجہ ہے جو جدید زندگی کی روح رواں بن گئی ہے۔ اس طرح نہایت شخصی قسم کے تصورات کا اظہار بھی اسی اضطراب کا پرتو ہے۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "جدیدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اب تک جو کہا گیا ہے یا کم از کم اس وقت ہمارے آس پاس جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہم عمداً انحراف کرتے رہیں اور نئے سے نئے زمانے کے ساتھ گامزن رہیں۔" یہی نہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جدیدیت وہ اندازِ نظر ہے جو "حال کے مسائل کی ترجمانی کو اپنا فرض گردانتا ہے۔"

ممکن ہے روایت اور بغاوت کے رشتے کے متعلق راشد کے مندرجہ بالا خیالات سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہو۔ لیکن اس سوال پر بحث تو ترقی پسند ادیبوں اور جدیدیت پسند ادیبوں کے حلقوں کے اندر مدت سے ہوتی آئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے۔ سردار جعفری نے کئی جگہ یہ بات کہی اور لکھی ہے کہ ہر عہد کا ایک مزاج اور آہنگ ہوتا ہے اور اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں یہ مزاج اور آہنگ بھی تیزی سے بدلتا رہتا ہے۔ اردو کی سست رفتار دنیا میں اس بدلے ہوئے آہنگ موضوع اور اسلوب وغیرہ کی مزاحمت ہوتی ہے۔ یوں بھی دیکھئے تو مصوری میں تبدیلی کی رفتار تیز نظر آتی ہے اور موسیقی میں سب سے سست۔

اس انداز سے دیکھئے تو میرا خیال ہے کہ کسی بھی ترقی پسند یا مارکسی ادیب اور نقاد کو راشد کی مندرجہ بالا تعریف پر اعتراض نہیں ہو سکتا اور نہ جدیدیت پر جب راشد 'بے قراری' اور 'اضطراب' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو کیا ماڈرن دنیا کے متعلق ان کی فہم پر مارکس کی چھاپ نظر نہیں آتی؟ لیکن راشد نے کسی جگہ کیا ہے کہ جدیدیت کی ابتدا ادب کے مزاج کی حیثیت سے فرانسیسی شاعر چارلس بودلیر (۱۸۲۱ تا ۱۸۶۷ء) سے ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شروع میں جدیدیت پسندوں نے بودلیر سے اثرات قبول کئے۔ جدید دنیا کو ایک ہیبت ناک درندہ حسن کا شدید دشمن تصور کر کے اسے مسترد کر دیا۔ اس دیو کے شکنجے سے بچنے کے لئے صرف دو پناہ گاہیں منتخب کیں۔ قحبہ خانہ اور شراب خانہ۔ ترسیل کو غیر ضروری یا ناممکن قرار دے کر نجی علامتیں اختیار کرنے لگے۔

انیسویں صدی میں جن لوگوں نے فکری ار تخلیقی سطح پر جدید دنیا کو سہنے اور اس سے دوچار ہونے کی کوشش کی ان میں یورپ میں گوئٹے۔ تالستائی۔ بودلیر دوستووسکی۔ مارکس وغیرہ سر فہرست ہیں اور ہندوستان اور خاص طور پر اردو میں غالب، سرسید، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ادیبوں کی اس فہرست میں مارکس کا نام شائد کچھ لوگوں کو چونکا دے لیکن ذکر فلسفے تاریخ کا ہو یا تنقید کا مارکس کے ذکر کے بغیر بات بنتی نہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ خود کمیونسٹ مینی فسٹو تخلیقی فن کا بہترین نمونہ ہے اور دوسری کتابوں میں بھی مارکس کی نثر بہترین ادب پاروں میں شمار ہوتی ہے۔

ہاں بات بودلیر کی ہو رہی تھی۔ بودلیر نے اپنے کئی مضامین میں جدید دنیا اور جدید فن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے مختلف مضامین اور آخری زمانے کی نثری نظموں میں اگر تضاد نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو جدید دنیا کیا ہے اس کے متعلق اس کے پاس کوئی واضح تصور نہیں ہے اور اسی لئے وہ جدید دنیا کی کوئی تعریف پیش نہیں کر پاتا۔ دوسرے وہ خود ذہنی طور پر ان تضادات کا شکار تھا جو ماڈرن دنیا میں نظر آرہے تھے۔

ابتدائی مضامین میں وہ خالص آرٹ کی جستجو کرتا ہے یہاں تک کہ وہ فوٹو گرافی اور جدید مصوری کو مسترد کر دیتا ہے اس لئے کہ ان میں "سچائی" پیش کی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "جہاں ہمیں حسن کے سوا اور کچھ نہ تلاش کرنا چاہئے وہاں ہماری پبلک صرف سچائی کی متلاشی رہتی ہے۔" حسن اور سچائی ترقی اور شاعری ایک ساتھ کیوں نہیں ہو سکتے؟ بودلیر کے پاس اسکا کوئی واضح جواب نہیں ہے۔ بودلیر کے اس تصورِ فن نے بہت مقبولیت حاصل کی لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب وہ شعر کہتا ہے تو اس کے یہاں وہی مادی دنیا، وہی مادی حقیقت، وہی مادی سچائی نظر آتی ہے جس کی وہ اپنے مضمون میں مخالفت کرتا ہے۔ اس کی نظموں میں پیرس ہر طرف جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ پیرس کے باسی، پیرس کے قحبہ خانے پیرس کے شراب خانے، وہ رات کا پیرس سہی مگر ٹھوس زندہ پیرس تو ہے۔

جس مضمون کا ابھی ہم نے ذکر کیا خود اس میں بھی بودلیر ایک ایسا قصہ بیان کرتا ہے جو اس کے نظریہ فن کے خلاف جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ایک بار فرانس کا مشہور ناول نگار بالزاک اپنے متعلق ایک قصہ سنا رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت منظر کو دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کا اداس اداس سا منظر تھا۔ ہر طرف ہلکی ہلکی برف، کچھ جھونپڑے ہیں اور کچھ بہت معمولی قسم کے کسان۔ ایک جھونپڑے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو غور سے دیکھنے کے بعد بالزاک بول اٹھا۔ "بہت ہی حسین۔ لیکن اس جھونپڑی میں جو لوگ ہیں وہ کیا کر رہے ہیں؟ ان کے دکھ، ان کے غم کیا ہیں؟ وہ سوچ کیا رہے ہوں گے؟ کیا فصل اچھی ہوئی؟ اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ انہیں بل بھی ادا کرنے ہوں گے۔"

بودلیر نے بالزاک کا یہ قصہ کیوں سنایا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سچائی سے ماورا خالص فن کی جو دنیا بودلیر فکری طور پر تعمیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس پر خود اس کو شک ہونے لگا تھا؟ بودلیر میں ایک زبردست تبدیلی اس وقت نظر آتی ہے جب وہ رومانی اور نیم رومانی غبار سے نکل کر ماڈرن دنیا کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔ وہ بحر اور قافیے کو تج کر نثری

نظموں کا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک نظم ہے جس کے عنوان کا ترجمہ ہم شاید کچھ اس طرح کر سکتے ہیں۔ "کھو جانا ہالۂ نور کا" "یا کھویا جانا دستارِ فضیلت کا"

نظم ایک مکالمے کی صورت میں آگے بڑھتی ہے جو ایک شاعر اور ایک عام آدمی کے درمیان ہوتا ہے۔ دونوں کی مڈ بھیڑ ایک بدنام کوچے میں ہوتی ہے۔ عام آدمی کے ذہن میں شاعر کا بہت اونچا مقام ہے۔ اس لئے جب وہ اسے اس بدنام کوچے میں دیکھتا ہے تو حیرت سے پوچھتا ہے۔

"ارے میرے دوست تم اور یہاں! تم ایسی جگہ! تم جو من و سلوۃ کھاتے ہو، آبِ حیات پیتے ہو! حیرت کا مقام ہے!"

شاعر اپنا ماجرہ بیان کرتا ہے۔ "میرے دوست تم تو جانتے ہو مجھے گھوڑوں اور گاڑیوں سے کتنا ڈر لگتا ہے! تو ہوا یہ ہے کہ ابھی جلدی میں جب میں سڑک پار کر رہا تھا۔ کیچڑ میں لت پت، چلتی پھرتی افراتفری کے درمیان جب کہ موت ہر طرف سے میری طرف بڑھ رہی تھی تو میں دفعتاً حرکت میں آیا اور میرا ہالہ میرے سر سے پھسل کر سڑک کی کیچڑ میں گر گیا۔ میں اتنا خوفزدہ تھا کہ اسے اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا اپنا نشانِ امتیاز کھو دینا اپنی ہڈی پسلی تڑوانے کے مقابلے میں کم ناخوشگوار بات ہے۔ اس کے علاوہ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ تاریکی میں بھی روشنی کی کرن دکھائی دیتی ہے۔ اب میں ہر جگہ آزادی سے گھوم سکتا ہوں۔ مجھے کوئی نہ پہچانے گا۔ گھٹیا حرکتیں کر سکتا ہوں۔ اپنے کو ہر قسم کی غلاظت میں جھونک سکتا ہوں۔ بالکل عام فانی انسان کی طرح۔ تو دیکھ لو میں یہاں تمہاری طرح موجود ہوں۔"

عام آدمی پوچھتا ہے۔ "مگر اپنے ہالے کے لئے آپ اشتہار نہیں دیں گے کیا؟ پولیس کو اطلاع نہیں دیں گے؟" شاعر کہتا ہے۔ "نہیں مجھے یہاں اچھا لگ رہا ہے۔ تم واحد شخص ہو جس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے سوا رکھ رکھاؤ اور تکلف سے میں اکتا جاتا ہوں۔ اور پھر یہ سوچ کر لطف آتا ہے کہ کوئی برا سا شاعر اسے اٹھا کر بڑے دھڑلے سے پہن لے گا۔ کسی کو

خوشی بہم پہنچانا کتنا اچھا لگتا ہے۔ خاص طور پر ایسے شخص کو جس پر ہنسا جا سکتا ہو۔ زید کے بارے میں سوچو، بکر کے بارے میں سوچو! لطف آئے گا نا؟"

ہالے کے استعارے پر غور کیجئے۔ اوپر ہم اِس کا ذکر مارکس کی زبان سے سن چکے ہیں۔
"بورژوازی نے ہر اُس پیشے سے اُس کے گرد کا ہالہ چھین لیا جس کی اب تک عزت ہوتی آئی تھی۔"

لافِ دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

کوہ کن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے (غالب)

یعنی نئی یا ماڈرن دنیا کا ایک بنیادی تجربہ تھے تقدیس کا خاتمہ دستار فضیلت کا سر سے گرنا۔ ہالۂ نور کا خاتمہ۔ مارکس کے یہاں یہ تجربہ ایک عالمگیر تاریخی حقیقت کی حیثیت سے ملتا ہے۔ اس تجربے میں ایک نیم رومانی انداز میں نظر آتا ہے جس میں کچھ مزاح کا پہلو بھی ہے۔ وہ ہنس رہا ہے خود اپنے اوپر اور دوسرے دستار بند شاعروں اور فن کاروں پر غالب کے یہاں یہ تجربہ ایک عالمانہ بے تعلقی بلکہ ذہنی جذبۂ برتری کے ساتھ نظر آتا ہے لیکن تجربہ سب کا ایک ہی ہے۔ دستار فضیلت یا ہالۂ نور کی تقدیس کا خاتمہ۔ مارکس کی اس بزم اور اس فہرست میں شرکت شاید اب قابل قبول معلوم ہونے لگی ہو۔ خود اپنے زمانے پر نظر ڈالئے تو فیض مجروح مخدوم ن م راشد، میراجی اور ان کے بعد کے شعرا، منٹو، عصمت، بیدی سے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین اور بعد کے ادیبوں کے یہاں یہ اندازِ نظر صاف نظر آ جائے گا۔

مارکس اور بودلیر میں سطح اور گہرائی میں فرق کے باوجود دونوں میں ماڈرن دنیا کے جدید تجربوں کو گرفت میں لانے کی کوشش ملتی ہے۔ دونوں میں ایک ملا جلا سا جذبہ نظر آئے گا۔ انبساط 'حیرت' ہیبت سب ہی کچھ ملے گا۔ تضادات سے بھرپور زندگی ایک کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ترقی پسندی ہو یا جدیدیت یا پس جدیدیت وغیرہ وغیرہ یہ ادبی سفر کا ایک تسلسل ہے جس میں متضاد احساسات متضاد جذبات سب سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہاں ذات بکھرتی بھی ہے اور اپنے آپ کو مجتمع بھی کرتی ہے کہ ان تضادوں کو عبور کرے۔ زندگی کی شکست وریخت کا مطلب ہی یہ ہوا کہ زندگی چل رہی ہے۔ سانس لے رہی ہے، جی رہی ہے۔

نئی دنیا کو محسوس کرنے کے لئے اور اس کے پیدا کردہ انبساط اور زہر غم کو رگ وپے میں اتارنے کے لئے اسے سمجھنا بھی ضروری ہے۔ غالب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ شعر کہنے کیلئے پہلے دل کو شیشے کی طرح غم کی آنچ میں پگھلانا پڑتا ہے۔ پھر اسے عقل کے سانچے میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ نظر بھی چاہئے جو پتھروں کے سینے میں چھپے ہوئے بت ناچتے دیکھ سکے اور لفظ ایسے نئے کہ ان کے منہ سے دودھ کی بو آئے۔

اقدار

سہ ماہی کتابی سلسلہ

جلد اول : شمارہ اول

جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء

قیمت فی پرچہ : 35روپے

ڈی لکس ایڈیشن : 60روپے

سالانہ : 100روپے

کمپوزنگ : عفیف ڈزائننگ گروپ

ناشر : رائٹرس گلڈ (انڈیا) لمیٹڈ

۲۲، غالب اپارٹمنٹس، پیتم پورا۔ دہلی ۔ ۳۴

مطبع : ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

سر پرست : سید شمیم کاظم

مدیر : علی جاوید

تقسیم کار

• موڈرن پبلشنگ ہاؤس

گولا مارکیٹ۔ دریا گنج، نئی دہلی

• ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

۲۶۵۲/۵۵ کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی

فون : ۳۲۴ ۳۵۴۴

خط وکتابت کا پتہ : ۲۲، غالب اپارٹمنٹس، پیتم پورا۔ دہلی ۔ ۳۴

فون : 701 2125

AQDAAR

URDU QUARTERLY

January-March 2001

Delux Edition:

Editor Ali Javed

22, Ghalib Apts.Pitampura,Delhi-110034

Ph:701 2125

اقدار
اردو سہ ماہی
نذر علی سردار جعفری و مجروح سلطان پوری